Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities
(Bi-Annual) Trilingual: Urdu, Arabic and English
ISSN: 2707-1200 (Print) 2707-1219 (Electronic)
Home Page: http://www.arjish.com
Approved by HEC in "Y" Category
Indexed with: IRI (AIOU), Australian Islamic Library, ARI, ISI, SIS, Euro pub.
Published by the Al-Khadim Foundation which is a registered organization under the Societies Registration ACT.XXI of 1860 of Pakistan
Website: www.arjish.com
Copyright Al Khadim Foundation All Rights Reserved © 2020
This work is licensed under a
Creative Commons Attribution 4.0 International License

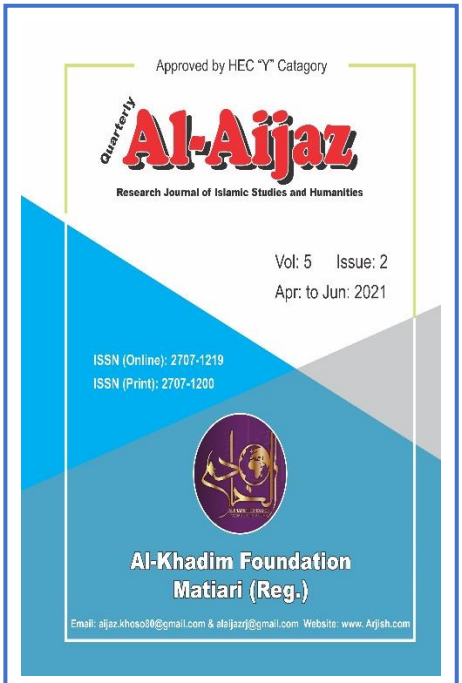

TOPIC:

The Main Features of Woman in Hindustani Society

AUTHORS:

1. Hajan Sumaira Syeda Shah, Ph.D Scholar (Urdu), GCWU Faisalabad
2. Dr. Zamurad Kousar, Associate Professor GCWU Faisalabad.

How to cite:
Syeda Shah, H. S. ., & Kousar, D. Z. . (2020). Urdu-11 The Main Features of Woman in Hindustani Society. *Al-Aijaz Research Journal of Islamic Studies & Humanities*, *5*(2), 146-156. https://doi.org/10.53575/Urdu11.v5.02(21).146-156

URL: http://www.arjish.com/index.php/arjish/article/view/293

Vol: 5, No. 2 | April to June 2021 | Page: 146-156

Published online: 2021-06-10

QR Code

ہندوستانی تمدن میں نسائی معاشرت کے خدوخال

The Main Features of Woman in Hindustani Society

Hajan Sumaira Syeda Shah*
Dr. Zamurad Kousar**

Abstract
The women civilization in hindustani culture is very important role. There are two main civilization, Mulims and hindus in Hindustan. The main duty of Hindustani woman to serve and obey their husband. However some values are different between the Muslim and Hindu woman in this society. The main features are dresses, parda, marriages, customs, education, family terms and their self respect.
Keywords: Hindustani Woman, Parda, Rasme Satti, Marriages, Education

ہندوستانی معاشرت میں نسائی تمدن کو خاص اہمیت حاصل تھی۔ متعدد سماجی اور مذہبی طبقات ہونے کی وجہ سے ان کے عقائد، رسوم لباس، شرعی احکامات میں تضاد تھا۔ جس کی وجہ سے خاص طور پر ہندو اور مسلمان عورتوں کی نسائیت میں یکسانیت بہت کم تھی۔ تاہم ہندوستانی معاشرت میں عورتوں کی حالت اور ان کے فرائض منصبی واضح طور پر کم سمجھے جاتے اگرچہ مسلمان عورت کا خانگی مقام ہندو عورت کے مقابلے میں اونچا تھا۔ لیکن بنیادی حقوق سے وہ بھی محروم تھی۔ ہندوستان میں ہندوؤں نے جو معاشرتی نظام قائم کیا ہوا تھا۔ اُس میں اعتدال بہت کم تھا۔ ضرورت سے زیادہ لچک دار اور سخت تھا۔ خاندان اور ذات برادری کے بندھنوں میں جکڑے افراد کو اپنی ذات کو اجاگر کرنے کا بہت کم موقع ملتا۔ ایسے میں ہندوستانی عورت کا نسائی تمدن مختلف پہلوؤں کے تناظر میں دیکھا جاسکتا ہے۔

ہندوستانی تمدن میں نسائی معاشرت بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ اس تمدن میں بنیادی طور پر عورت کا کام مرد کی خدمت کرنا تھا۔ ہندوستانی عورت ایک گھریلو عورت تھی جو گھر اور اس سے منسلکہ امور پر تعینات تھی۔ عورتوں کے فرائض منصبی مردوں کی نسبت کم تر تھے۔ ہندوستانی عورت مکمل طور پر انحصار مرد پر کرتی تھی۔ بیٹی کی صورت میں باپ سرپرست تھا۔ بیوی ہونے کے ناطے خاوند کی ذمہ داری تھی اور اگر شوہر وفات پا گیا ہے تو بڑا بیٹا اس کی نگرانی کرتا۔ معاشرے میں اسے ذہنی طور پر گندا اور نااہل سمجھا جاتا ہندوؤں کے عقیدے میں بیٹیوں کا پیدا ہونا ہی باپ کے لیے بدشگون ہوتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمانوں نے قدیم ایرانی روایات کی تقلید کی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوستانی معاشرت میں مسلمانوں نے بھی عورت کو وہ حق اور درجہ نہ دیا جو کہ اس کا حق تھا۔ ہندوستانی معاشرت میں عورت سے پاکدامنی کی توقع اور مرد کا شہوانی خواہشات کا علمبردار ہونا اس بات پر دلالت کرتا تھا کہ فطرت کو بدلنے کی خواہش عورت سے منسوب ہے۔ گویا عورت کے کوئی جذبات ہی نہیں نہ ہی اُسے جنسی خواہشات کی تکمیل کا حق حاصل تھا۔ بقول ڈاکٹر اقبال حسین:

* Ph.D Scholar (Urdu), GCWU Faisalabad
** Associate Professor GCWU Faisalabad.

"مذہبی طور پر مسلمان بیویوں کو غیر مسلم بیویوں کے مقابلہ میں زیادہ تحفظ حاصل ہے۔"[۱]

ہندوستانی معاشرت میں عام طور پر عورت کے ساتھ مردوں کا ربط وضبط بہت کم تھا حتی کے بیوی ہونے کی صورت میں بھی اسے خانگی زندگی کے اہم امور کے لیے نابلد خیال کیا جاتا تھا عورت کا کام مرد کی محبت حاصل کرنا اور اس کے تابع فرمان بن کر زندگی گزارنا تھا۔ ادنی طبقے یعنی غریب خاندان کی عورتیں خصوصاً کسان عورتیں دن رات ہمہ وقت کام کاج میں مصروف ہوتی اور ان کی ذہنی تفریح کے لیے زندگی میں کوئی ایسا موقع میسر نہ آتا جس سے ان کی جمالیاتی حِس کو بھی تسکین پہنچے ایسے حالات میں ان کے ذہنی نشو ونما کے بارے میں کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اگر امیرانہ طبقے کی عورتوں جائزہ لیں تو اندازہ ہوگا یہ عورتیں بھی عدم تحفظ کا شکار تھیں۔ جس کے لیے وہ بے شمار علوم وفنون سیکھتی تاکہ اُن کا مستقبل محفوظ رہ سکے۔ ان میں میرابائی، روپ متی، دیول رانی ہندو نسائی تہذیب کی عمدہ مثالیں ہیں۔ مسلمان خصوصاً سلاطین کی عورتوں کا مشاہدہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انہوں نے عورتوں کے حقوق کے بارے میں اعلیٰ روایات کو فروغ دیا۔ شاہی خاندان کے لوگ اپنی عورتوں کو تعلیم وتربیت سے دور نہیں رکھتے تھے۔ مغلوں کے دور حکومت میں جو ہندوستانی امرا تھے انہوں نے صحت مند روایت کو جنم دیا۔ گلبدن کے بیان کے مطابق بادشاہ ہمایوں کے دور حکومت میں شاہی حرم کی جو عورتیں تھیں۔ اُن کے مرد دوست مرد مہمان بھی تھے جن سے وہ کھلم کھلا بات چیت کیا کرتے تھیں۔ اس کے علاوہ مردانہ لباس پہن کر باہر بھی چلی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ پولو کھیل بھی کھیلا کرتی تھیں اور موسیقی سے محظوظ ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ مختلف علوم وفنون کی مہارت رکھتی تھیں۔ غلیل کا فن بھی انہیں آتا تھا۔ مغل خاندان میں زیادہ آزادانہ طرز فکر کی وجہ سے ان خواتین میں خودداری اور عزت کا احساس بیدار ہو گیا تھا۔ اور مغل بادشاہوں کی مائیں ذجانتی تھیں جتنا کہ ان کے بیٹے مہارت رکھتے تھے حتی کہ ان کی داشتائیں بھی علم وہنر میں کسی سے کم نہ تھیں۔

☆پردہ

عورت کے لیے پردہ کا دوسرا معنی حرم مراد لیا جاتا ہے۔ حرم سے مراد قیام کی وہ جگہ بھی ہیں۔ جہاں عورتوں کو عام لوگوں کی نظروں سے دور رکھا جاسکے۔ ہندوستانی معاشرت میں جیسے ہی لڑکی "سن بلوغ" کو پہنچتی تو وہ پردہ کرنا شروع کر دیتی اس رواج کی پابندی وہ اس وقت تک کرتی جب تک وہ بچہ کی ماں بنے کے قابل نہیں ہو جاتی تھی اس رسم ذکی پابندی کی پاداش میں عوتیں چار دیواری سے باہر قدم نہیں نکالتی تھیں۔ حرم میں ان باپردہ خواتین کے علاوہ خواجہ سرا اور دیگر ملازمین جو زنانہ حصوں کی حفاظت اور دیکھ بھال کے لیے تعینات تھے وہ بھی حرم میں موجود رہتے تھے۔۔ پردہ کی روایت کے بارے میں مختلف اور متضاد نظریات پائے جاتے ہیں حسن الدین احمد اس بارے میں لکھتے ہیں۔

"پردہ قدیم زمانہ سے ہندوستان میں رائج ہے یہ مسئلہ بڑا اختلافی ہے کہ اس کی ابتداء کیسے ہوئی۔ مسلمان اسے یہاں پانے ساتھ لے آئے یا یہ پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ مسلمان پردہ کو اپنے ساتھ نہیں لائے کیونکہ جو پردہ ہندوستان میں رائج ہے وہ کسی اسلامی ملک میں رائج نہیں اسی طرح یہ کہنا بھی غلط ہے کہ پردہ پہلے سے ہندوستان میں موجود تھا واقعہ یہ ہے کہ رسم چین سے ہندوستان میں داخل ہوئی۔ اس رسم کے تحت عورتیں گھر کی چار دیواری میں رہتی اور اہل خاندان کے علاوہ کسی مرد کے سامنے نہیں آتیں جب بھی کسی

خاص ضرورت سے باہر نکلنا ہوتا تمام جسم اور چہرے پر کپڑا اوڑھ لیتی۔"[2]

دراصل ہندوستانی معاشرت میں عورتیں مردوں سے الگ تھلگ رہتی تھیں اور جو پردہ وہ کرتی تھیں۔ انہیں گھونگھٹ کہا جاتا تھا۔ ان عورتوں کا دائرہ کار صرف گھر تک محدود تھا۔ مسلمان جب ہندوستان میں داخل ہوئے تو امیرانہ و شاہانہ انداز بھی لائے اور ان کی خواتین پردے کا اہتمام بھی کرتیں تھیں۔ بقول ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان

"اس میں شک نہیں کہ ہندوستان میں جو پردے کے شدت کی یہ حد ہوگئی ہے اس کی ابتدا یہ تھی کہ زمانہ وسطی میں جب مسلم حملہ آور ہندوستان میں آئے تو اُن کی جماعت بہت قلیل تھی اور اُن کی اغیار کی بہت بڑی جماعت کے درمیان رہنا پڑا۔ عورتوں کی حفاظت سے جان و مال کی حفاظت زیادہ ضروری نہ تھی۔"[3]

اس کے علاوہ منگولوں کے خوف سے عدم تحفظ کا شکار رہنے والے ہندوستانی اپنی عورتوں کو اندر ہی رکھتے تھے۔ یہ خوف تقریباً دو سو سال جاری رہا۔ تاہم مسلمان کسان کی عورتیں پردہ یا نقاب کا خاص خیال نہیں رکھتی تھیں۔ وہ کھیتوں میں کام بھی کرتی تھیں۔ تاہم جب کسی اجنبی سے ان کا سامنا ہوتا تو وہ اپنے دوپٹے یا ساڑھی کے پلو سے اپنا منہ ڈھانپ لیتی تھیں تاہم ان کے بازو کھلے رہتے تھے۔ ہندوستان کا کسان مرد زیادہ شادیاں نہیں کرتا تھا۔ لہٰذا ہندوستانی عورت کا کوئی رقیب بھی عام طور پر گھر میں نہیں ہوتا تھا۔ اگر دیکھا جائے تو ہندوستان کی اس دور کی عورت جسمانی طور پر صحت مند، مضبوط اور توانا تھی اور ایسی کوئی بھی وجہ نہ تھی کہ جس پہ وہ اپنی بیویوں پر شک کرتے اور اُسے پردہ کا حکم دیتے۔ اعلیٰ طبقے کی خواتین اس حد تک پردہ کرتی تھیں جہاں تک ان کے ذرائع انہیں اجازت دیتے تھے۔ البتہ اعلیٰ طبقے میں پردہ شرافت کی دلیل سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستانی معاشرت خصوصاً مسلمانوں میں ایک عام روایت یہ بھی تھی کہ جو خاندان جتنا اعلیٰ طبقے کا مالک ہوتا اُس کا گھر اتنا ہی بلندی پر اور کھڑکیاں چھوٹی ہوا کرتی تھی پردے کی ترقی یافتہ شکل مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے کے بعد قائم ہوئی۔ فیروز شاہ تغلق نے عورتوں پر پابندی لگائی کہ وہ دہلی سے باہر مقبروں پر نہیں جاسکتیں۔ چنانچہ ایک شریف خاندان کی عورت اپنے چند ملازمین کے ساتھ بند پالکی میں سفر کرتی تھی اور خواتین ایک لمبے کپڑے جسے آج کل برقع کہا جاتا ہے اس میں لپٹ کر نقل و حرکت کرتی تھیں۔ امراء سلاطین اپنی عورتوں کے لیے ایسی پالکیاں استعمال کرتے تھے جو ہر طرف سے ڈھکی ہوئی ہو اور مقفل کی گئی ہوں۔ ہندوؤں نے مسلمانوں کے اس طرز معاشرت کو بغیر کسی عذر کے سرعت کے ساتھ استعمال کر لیا تھا۔ ہندوستانی معاشرت میں ہندو مسلم دونوں مذاہب میں عورت اور مرد کے باہمی اختلاط اور بات چیت پر پابندی لگادی جاتی تھی۔ جس سے اُس کی شادی ہونے جارہی ہو ہندو شادی کا انتخاب کرتے وقت اپنی گوت سے باہر لیکن اپنی ہی ذات میں شادی کرتا تھا دوسرے ذاتوں میں شادی شدت سے ناپسند کی جاتی تھی۔ پردے کی پابندی بھی ایک حد تک اس لیے قائم ہوئی تاکہ نامحرم لوگوں سے دور رہا جائے۔ جس سے شادی ہوسکتی ہے اور کنبہ یا قبائل کے بزرگوں کو ہمہ وقت یہ اندیشہ رہتا کہ اگر مرد اور عورت میں ممنوعہ حدود سے زیادہ تعلق قائم ہوگیا تو اس کا انجام بدکاری اور رسوائی و ذلت کا باعث بنے گا اور اگر عورت نے اپنی پسند کی شادی اپنے خاندان کی مرضی کے خلاف کرلی تو یہ خاندان کے لیے باعث شرمناک ہوگا۔ گویا عورت کے کردار اور اُس کے چال چلن پر

زور دیا جاتا اور حتی الامکان یہ کوشش کی جاتی کہ وہ ہر لحاظ سے پاکدامن اور نیک سیرت ہو۔ اور اس کی پاکیزگی کی شناخت کا صرف ایک ہی واحد ذریعہ تھا کہ وہ عورت حرم میں باپردہ موجود ہو۔ جسے نامحرموں سے ملنے کا کوئی موقع میسر نہ ہو اور اگر کوئی عورت اس کے برعکس زندگی گزار رہی ہو تو ایک شریف خاندان کا مرد اُس سے شادی کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔

☆شادی

شادی کے لیے عمر کی کوئی خاص حد مقرر نہ تھی۔ مسلمان اور ہندو کم سنی کی شادی کو مناسب خیال کرتے تھے۔ مغل بادشاہ اکبر نے ان معاملات میں دخل اندازی کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ اور انہوں نے شادی کے لیے لڑکے کی عمر کم از کم 16 سال اور لڑکی کی 14 سال مقرر کی ۔ یہ وسوخ سے نہیں کہا جا سکتا کہ ان قوانین پر کس حد تک عمل ہوا۔ ہندوؤں کے نزدیک کم سنی کی شادی کی چند وجوہات تھیں۔ جن کے بارے میں حسن الدین احمد یوں رقمطراز ہیں۔

"ہندو قوانین کے تحت کم عمری کی شادی کی موافقت کی گئی ہے اور کہا گیا ہے کہ لڑکی کی شادی اس کے سنِ بلوغت کو پہنچنے سے قبل کر دینی چاہیے۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو وہ خاندان کے لیے رسوائی کا باعث بنے گی اور اس کے والدین بھی آئندہ دنیا میں عذاب میں مبتلا ہوں گے۔"[4]

ڈاکٹر تاراچند یوں رقمطراز ہیں۔

"ہندوؤں کا معاشرتی نظام ایک ہی وقت میں ضرورت سے زیادہ لچک دار اور سخت تھا۔ خاندان اور ذات برداری کے بندھنوں میں جکڑے فرد کو اپنی خودی کے اجاگر کرنے کا بہت کم موقع تھا۔"[5]

مسلمان خاندانوں میں بھی شادی کم سنی میں ہو جاتی تھی۔ فقہ فیروز شاہی میں قانونی طور پر لڑکیوں کی شادی کی عمر 9 سال مقرر کی ہوئی تھی۔ جو بالکل غیر فطری تھی۔ بچوں کی شادی کرنا اور شادی سے متعلقہ تمام رسوم و تقریبات کی ذمہ داری والدین اور خصوصاً والد پر ہوتی۔ شادی کے وقت والدین کو بہت سے نازک اور پیچیدہ مسائل سے دوچار ہونا پڑتا۔ جیسا کہ خاندان کا مرتبہ، آبائی رسم و رواج، روایات اور فریقین کی سماجی عزت سب کا خیال رکھنا پڑتا۔ والدین عام طور پر اپنی ذمہ داری نہایت احتیاط اور پوری تفصیل سے کرتے تھے۔ شادی شدہ دلہا دلہن کے ذاتی معاملات ذاتی کی نسبت خاندانی معاملات تصور کیے جاتے تھے۔ ہندوستانی معاشرت میں شادی ایک نہایت اہم سماجی امور کے باعث گھریلو زندگی کا ایک انتہائی اہم واقعہ تصور کیا جاتا تھا۔ ہندوستانی معاشرت میں سب سے پہلے باہم گفت و شنید سے رشتہ طے پاتا اور پہلی رسم تلک یا منگنی کی صورت میں ادا کی جاتی۔ رسم اقرار کے بعد شادی کے لیے مناسب دن اور تاریخ کا تعین کیا جاتا۔ جسے لگن کہتے تھے۔ تاہم دھوم دھام سے شادی کی تیاریاں شروع ہو جاتیں۔ عزیز و اقارب، دوست، رشتہ دار سب کو دعوت نامے بھیجے جاتے۔ لڑکی والے گھر منڈپ تیار کیا جاتا۔ دروازوں پر آم کے پتوں کے تورن اور پھولوں کے ہار لٹکائے جاتے۔ اپنی دلی خواہشات اور خوشی کو سب پر عیاں کرنے کے لیے پڑوسی بھی اپنے در و دیوار کو سجاتے تھے۔ یوں رات کا سماں بندھتا۔ زندگی کی نئی لہر تازہ رگوں میں دوڑنے لگتی۔ خصوصاً گاؤں میں تو پوری آبادی دلہن کے گھر میں رات کو اکھٹ کر کے گیت گاتی تھی۔ مقبول عام سہاگ گیت سب زبانوں پر جاری ہوتے۔ غرض مسلمانوں

اور ہندوؤں دونوں کے ہاں مزاحیہ اور سنجیدہ رسوم کئی تو ہم پرستانہ تقریبات کا انعقاد دلہا اور دلہن کے گھر کیا جاتا جیسے ہی براتی اکھٹے ہوتے اور باقی تیاریوں کے اختتام پر دلہا والے شہنائی، باجے اور بھیڑ کے جوش و خروش کے ساتھ دلہن کے گھر کی طرف رواں دواں ہوتے۔ رنگین آراستہ و پیراستہ سجے ہوئے (بارکش) اس سفر کے لیے استعمال کیے جاتے دلہن کے گاؤں یا اس کے علاقے میں داخل ہوتے ہی استقبال کے لیے لوگ موجود ہوتے۔ خوش آمدید کہہ کر مطلوبہ جگہ پر بیٹھا دیا جاتا۔ اور شربت پان سے ان کی تواضع کی جاتی۔ منڈپ میں دلہا اور دلہن کے سات پھیرے دلوائے جاتے اور گانٹھ کی رسم ادا کی جاتی۔ جبکہ مسلمان اس رسم کو نکاح کے ذریعہ ادا کرتے۔ نکاح اور منڈپ کی رسمیں ادا کرنے کے بعد سہاگ کے گیت گائے جاتے تھے۔ مسلمانوں میں کبھی کبھی اس موقع پر بادام اور مصری نچھاور کرنے کی رسم ادا کی جاتی۔ جسے عام طور پر خوش بختی کی علامت سمجھ کر لوگ گھر لے جاتے تقریبات ممکن ہے مختلف علاقوں میں اور صوبوں میں مختلف ہوں۔ لیکن کم و بیش پورے ہندوستان میں شادی کی تقریبات اسی انداز میں منائی جاتی۔ دلہن کے گھر والوں کی معاشی حالات کو مد نظر رکھتے ہوئے بارات ایک یا زیادہ سے زیادہ دس دن قیام کرتی۔ اس دوران کئی قسم کی رسوم ادا کی جاتیں۔ جو کہ دور قدیم کی دلکش اور دلچسپ یادگاریں ہیں۔ رخصتی کے وقت دلہن کو ڈھیروں جہیز دے کر رخصت کیا جاتا۔ چونکہ دلہن کا اپنے گھر سے ناطہ کٹ جاتا اور وہ اپنے شوہر کے خاندان کا ایک رکن تصور ہوتی اور شوہر کی خواہش کا احترام اس کے اولین فرائض میں شامل ہوتا۔

☆رسم ستی

ہندوستانی معاشرت میں یہ ایک بھیانک رسم ستی بھی موجود تھی جس میں ایک ہندو کی بیوی جس کا شوہر مر جاتا تو اسے بھی جلا دیا جاتا اس رسم کو رسم ستی کہا جاتا تھا اور جو عورت اپنے آپ کو آگ کے سپرد کر دیتی تھی۔ وہ ستی کہلاتی تھی۔ مجموعی طور پر اگر دیکھا جائے رسم ستی ہندو معاشرت کے اعلیٰ طبقوں تک ہی محدود تھی۔ بقول ڈاکٹر بدنی پرشاد:

"معتدد صدیوں کے بعد پنڈتوں نے وبد کی رچاؤں کا مطلب تبدیل کر کے اُس سے ستی کا طریقہ نکالا لیکن یہ صاف ہے کہ اُس زمانے میں بیوہ شوہر کے ساتھ جلائی جاتی تھی۔"[6]

راجپوت اس رسم کو بہت پسند کرتے تھے۔ جو ادنی طبقے کی خواتین تھی۔ وہ اپنے شوہر کی ارتھی جلانے کے لی شمشان گھاٹ تک بھی نہیں جاتی تھیں۔ یہ بھیانک فرض دو طرفہ نہ تھا۔ اگر شوہر کی زندگی میں اُس کی بیوی فوت ہو گئی تو شوہر کے لیے ستی کی رسم کا کوئی وجود نہیں تھا۔ یہ روایت بہت قدیم دور سے ملتی چلی آرہی ہے۔ ستی کا رواج روایت میں دو طرح سے پایا جاتا تھا۔ ایک اپنے خاوند کے مردہ جسم کے ساتھ اسے جلایا جاتا دوسرا خاوند کے مردہ جسم کے بغیر علیحدہ بھی جلایا جاتا تھا۔ اس طرح مرنے کو سیہہ مرن بھی کہا جاتا تھا۔ ایک اور بات بھی توجہ طلب کہ اگر شوہر بیوی سے دور ہے اور اس کی موت واقع ہو گئی ہے یا پھر بیوی حاملہ ہے اور اس کا شوہر مر گیا ہے تو بچہ پیدا ہونے کے بعد خاوند کی ایسی چیز جو اس کی نشانی تصور کی جاتی ہو اُسے ساتھ ملا کر عورت کو جلایا جاتا تھا۔ اس طرح کے جلنے کو انومرن کہتے تھے۔ تاہم ان صطلاحات کو سہہ گمنا جس کے معنی ہیں۔ ساتھ جانا اور انوگمنا بھی کہتے تھے۔ اگر کسی ہندو کی ایک سے زیادہ بیویاں ہوتیں تو خاوند کے ساتھ مرنے کا اعزاز

بڑی بیوی کو حاصل ہوتا اور باقی بیویوں کو الگ الگ جلایا جاتا۔ اس موقع پر تمام بیویاں اپنے ذاتی اختلافات بھلا کر اُسی آگ میں جل مرنے کو ترجیح دیتیں جس میں ان کے خاوند کو جلایا جاتا تھا۔ اپنے شوہر کی لاش کے جل مرنے کا بیان بڑا اور دردناک ہے۔ جسے مختلف لوگوں نے بڑے سوز و گداز کے ساتھ پیش کیا ہے۔ مثال کے طور پر ایک عورت کا خاوند جنگ لڑنے کے لیے گیا اور شہید ہو گیا۔ جب بیوی یہ خبر سنتی ہے تو غُسل کرتی ہے اپنے سب سے بہترین کپڑے یا پھر شادی کا جوڑا اگر میسر ہو تو پہن کر اپنے زیورات زیب تن کرتی ہے اور تیزی کے ساتھ جلوس کی شکل میں اس کو شمشان گھاٹ لے جایا جاتا ہے۔ اور اسے نئی اور خوشگوار زندگی کی مبارک بادیں دی جاتی ہے۔ وہ عورت گھوڑے پر سوار ہوتی ہے۔ جس کے ایک ہاتھ کھوپرا اور دوسرے ہاتھ میں شیشیہ ہوتا ہے یہ جلوس گانے اور باجے کے ساتھ سایہ دار درختوں کے جھنڈ کی طرف رواں دواں ہوتا ہے۔ اس جھنڈ میں پتھر کی مورتی اور تالاب ہوتا ہے اسی تالاب کے قریب آگ جلائی جاتی ہے۔ جس پر لگا راتل کا تیل ڈالا جاتا ہے۔ یہ آگ تمام لوگوں کی نظر سے دور ہوتی ہے۔ جب سایہ دار جھنڈ میں عورت پہنچ جاتی تو اُس تالاب میں نہاتی اور اُس وقت وہ اپنے قیمتی لباس اور زیورات سب ایک ایک کر کے آگ کے سپرد کر دیتی۔ یہ سب جلا لینے کے بعد وہ کسی سے اَن سلا کپڑا مانگ کر اپنے بدن پر لپیٹ لیتی اور بڑی ہمت اور ثابت قدمی کے ساتھ اُس آگ کی طرف اپنے قدم بڑھاتی جو ابھی تک اُس کے آنکھوں سے اس اوجھل تھی۔ وہ عورت ساتھ ہی ساتھ اگنی دیوی سے دُعا کرتی اور عبادت کرتی جاتی اور بغیر کسی چون وچرا کے اپنے آپ کو دوزخ نما آگ کے شعلوں کے سپرد کر دیتی آگ میں کود جانے کے ساتھ ہی ڈھول اور باجوں کے شور سے لوگوں کی توجہ اس بھیانک کھیل سے ہٹانے کی کوشش کی جاتی اور آگ کے پاس لوگ اُس عورت کے اوپر جو آگ میں جل رہی ہوتی ہے اُس پر لکڑی کے بھاری ٹکڑے رکھ دیتے ہیں تاکہ وہ عورت اگر اس آگ سے نکلنا بھی چاہے تو نکل نہ سکے۔ ابن بطوطہ اس رسم کے چشم دید گواہ تھے اس کے علاوہ دیگر ذرائع سے بھی اس صورت حال کی تصدیق ہو چکی ہے۔ ستی کی رسم ادا کرنے کے لیے مذہبی طور پر برہمن کی ذمہ دار لگائی جاتی کہ وہ کیسے بیوہ کو جلنے کے لیے قائل کر سکتا تھا۔ مثلاً برہمن بیوہ عورت کو اس بات کے پختہ یقین دلاتا ہے کہ ایک بار جل مرنے کے ساتھ ہمیشہ کے لیے اُسے نئی زندگی ملے گی۔ جس میں وہ اپنے شوہر کے ساتھ عمدہ پوشاک کے ساتھ نہ ختم ہونے والی زندگی گزارے گی۔ اس کا ستی ہو جانا اس کے لیے شادی سے بھی زیادہ خوش قسمتی کا باعث ہے کیونکہ اس سے اسے اپنے شور کی ہمیشہ کی قربت اور ساتھ نصیب ہو گا۔ لیکن اگر اس نے ستی کی خلاف ورزی کی تو اس کی روح ہمیشہ کے لیے ارواح خبیثہ میں شمار ہو گی اور اسے کبھی بھی چین نصیب نہیں ہو گا۔ گویا بیوہ کے لیے اور کوئی راستہ نہ رہتا سوائے ستی ہونے کی رسم کو ایک تفریح کے طور پر بھی لیتے تھے۔ تاہم جو دور اندیش اور مذہبی رجحان رکھنے والے ہوتے وہ ستی والی عورت کو ایک قاصد تصور کرتے اور اُسے اپنے مرنے والوں کے نام کئی پیغامات دیتے جو انہیں جا کر بتائے گی۔ ستی کی رسم جیسا کہ روایتوں سے ظاہر ہوتا ہے ستی کی رسم کو نہ ختم کرنے کی وجہ دیگر سماجی امور بھی ہیں۔ رسم ستی کی حوصلہ افزائی اس وجہ سے بھی پروان چڑھی کہ ہندوستانی بیوہ کی زندگی کو انتہائی بدترین گری ہوئی مخلوق تصور کیا جاتا تھا۔ اس لیے بیوہ عورت یہی اپنے حق میں بہتر سمجھتی کہ وہ خود کو آگ کے سپرد کر دے اس سے نہ صرف بیوہ کی زندگی بلکہ اس کے خاندان کی عزت و ناموس کا بھی یہی تقاضا تھا کہ وہ جل مرے ایسا نہ کرنے کی صورت میں عورت اپنے شوہر کی نافرماں اور بدکرداری

کادھبہ لے کر جینے پر مجبور تھی اور اس پر معاشی حالات بھی تنگ کر دیئے جاتے۔ سوائے اس کے بچوں کے تمام جہیز اور وراثت اس کے خاوند کے رشتے داروں کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ ہندوؤں کے اس مروجہ قانون کو مسلمان حکمران کے طرزِ فکر کی روشنی میں دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ مسلم حکومت نے یہ قانون وضع کر دیا تھا کہ کسی بھی طبقے میں عورت کو اسی کی مرضی کے خلاف جلنے پر مجبور نہ کیا جائے جب تک اجازت نامہ نہ ہو۔ تاہم اجازت نامہ کسی نہ کسی طریقے سے ہندو عورت سے لیا جاتا تھا۔ مغل بادشاہت میں ہمایوں فقط ایسا بادشاہ تھا جس نے ستی کی ایسی تمام رسم پر پابندی لگادی جس میں یہ شرط رکھی گئی کہ ایسی عورت جو بچہ پیدا کرنے کی عمر سے آگے نکل گئی ہو اسے ہر گز نہ جلایا جائے چاہے وہ خود بھی اس کی خواہش کرے۔ یقیناً ہندوستانی معاشرت کی اصلاح میں ہمایوں کا یہ بہت بڑا اقدام تھا شاہ ہمایوں کے اس اقدام پر ہندو مذہب سے تعلق رکھنے والوں میں شدید احتجاج کی لہر دوڑ گئی اور ضعیف الاعتقاد بادشاہ کو یقین دلانے کی کوشش کی گئی کہ اس مقدس فریضہ پر پابندی لگانے پر وہ خدا کے قہر سے محفوظ نہیں رہے گا اور اس کی حکومت زوال کا شکار ہو گی۔ لہٰذا بادشاہ کو اپنا قانون واپس لینا پڑا۔ تاہم ستی کی رسم میں بادشاہ کے ملازمین موجود رہتے تاکہ غیر یقینی صورت حال پر قابو پایا جاسکے یعنی عورت کی مرضی کے خلاف اُسے جلایا جارہا ہے تو اُسے بچالیا جائے۔ ستی رسم کے سلسلے میں اکبر بادشاہ نے خود مداخلت کر کے کتنی عورتوں کو ستی ہونے سے بچالیا۔ لیکن وسوخ سے نہیں کہا جاسکتا کہ مسلم حکمرانوں میں سے کسی سے اس رسم پر مکمل پابندی عائد کی گئی ہو ہندوؤں کی دوسری رسموں کے برعکس مسلمانوں نے ستی کی رسم کو ناقابل قبول قرار دیا اور ستی کی یہ رسم مسلمانوں میں ترقی نہ پاسکی بلکہ مسلمانوں نے اس بہیمانہ رسم کی روک تھام کے لیئے اپنی کوشش جاری رکھیں۔ بقول ڈاکٹر اقبال:

"راجہ رام موہن رائے اور ان کے رفقانے قدیم مقدس کتابوں سے حوالے دے کر یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ بیوہ عورتوں کو زندہ جلانے کی اس بہیمانہ رسم کو قانوناً ممنوع قرار دے دیا۔"[7]

☆لباس، خوشبو، زیورات و سنگھار

ہندوستانی عورت کا لباس عام طور پر دو طرح کا ہوتا تھا۔ ایک لباس تو یہ تھا کہ ایک لمبی چادر ہوتی جو عام طور پر مکمل کا کپڑا ہوتا تھا جیسے ساڑھی کہا جاتا تھا۔ یہ کپڑا ٹانگوں سے لپٹا ہو کاندھے تک جاتا اور عورتیں خاص طور پر مسلمان عورتیں غیر مرد دیکھ کر ساڑھی کا ایک پلو سر کے اوپر بھی کر لیتی تھیں۔ بدن پر قمیض نما ایک چھوٹی چولی پہنتی تھیں۔ بعض عورتیں خصوصاً جوان عورتیں چولی کی جگہ رنگین گہرے رنگ کی انگیا بھی پہنتی تھیں۔ دوسری قسم کے لباس میں لہنگا جو خاص طور پر دوآبے میں پہنا جاتا تھا۔ جس کے اوپر چولا اور ساتھ دوپٹہ ہوتا تھا۔ گجرات کی عورتیں عام طور پر سنہریزری والے جوتے پہنتی تھیں۔ مردوں کی نسبت عورتیں زیاتے کا استعمال کرتی تھیں۔ اکثر عورتیں مرہم جو کہ میٹھا خوشبودار ہوتا اُسے بھی جسم پر ملتی تھیں۔ بعض اوقات زعفران میں سفید چندن، کافور، مشک، سب کو اچھی طرح یکجا کر کے اور عرق گلاب میں گوندھ کر استعمال کیا جاتا تھا۔ عود کی لکڑی کو بطور خوشبو گھر میں سلگایا جاتا تھا تاکہ مہکنے کا احساس گھر پھیل جائے۔ علاوہ ازیں اگر عورتیں باہر کسی سے ملنے جاتیں تو بالوں میں پھولوں کے گجرے لٹکاتیں اور ماتھے پر تلک لازماً لگاتیں۔ عورتیں اپنے فرصت کے لمحات میں اپنے

حسن اور بناؤ سنگھار کو زیادہ اہمیت دیتی تھیں۔ سندور کو مانگ میں سجانا بالوں کے سنگھار میں ایک اہم سنگھار تھا۔ آنکھوں میں سرمہ لگاتیں، ہونٹوں میں پان کا استعمال کرتیں، خوشبو بدن پر لگاتیں، دانتوں کے لیے مسی کا استعمال کرتیں۔ اس کے علاوہ بھوؤں کو کالا نظر آنے کے لیے کالا سفوف استعمال کرتی تھیں۔ اس کے ساتھ ساتھ مہندی کا رواج بھی ہندوستان میں آہستہ آہستہ بہت مقبول ہوتا گیا۔ شمالی ہند کی عورتوں کے بال عام طور پر لمبے ہوتے تھے جبکہ جنوبی ہند کی عورتیں بناوٹی بالوں کا استعمال بطور فیشن کرتی تھی۔ بقول ڈاکٹر اقبال حسین:

"عورتیں زیورات کا استعمال کرتی تھیں۔ ماتھے پر جواہرات سے مرصع زیور کا بھی استعمال ہوتا تھا۔ عورتیں اور مرد کانوں میں زیورات پہنتے تھے۔ گلے میں بھی زیورات پہننے کا رواج تھا۔"[8]

زیورات میں ہندوستانی عورت کا کانوں میں بالے پہننا اعلیٰ خاندان کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ ہندوستان کی عورت کی سب سے بڑی کمزوری زیور تھا سر سے پاؤں تک زیورات پہننا زیادہ پسند کرتی تھیں اور پورے جسم پر زیوارات کا موجود ہونا ہندوستانی عورت کے لیے سہاگ کا سلامت ہونا شمار ہوتا تھا۔ بیوہ ہونے کی صورت میں عورت اپنے ماتھے کا سندور اور زیورات کا استعمال کر دیتی تھیں۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ زندگی کی تمام خوشیوں اور عیش و عشرت سے دستبردار ہونے کا اعلان کر رہی ہیں۔ بعض ماہرین کے خیال میں ہندوستانی عورت سولہ سنگھار کرنا ضروری خیال کرتی تھی جس کے لیے سر، کان، بازوؤں، گردن، انگلیاں، ران۔ گلے، ناک اور پیروں میں پہننے جانے والے زیورات شامل تھے۔ ہندو کنواری لڑکی کا ذات کا نشان لگانا، ماتھے پر چندن کا ٹیکا، بالوں کی سجاوٹ، کانوں میں آویزے، چھوٹی چھوٹی گھنگروؤں والی پیٹی جو سینے کے لیے ہوتی تھی۔ ناک کے لیے سونے کی بالی ان سب کی ایک لمبی فہرست ہے جو ہندوستانی عورت اپنے زیورات میں استعمال کرتی تھیں۔

"امراء کی عورتیں پوری آستین کا تنگ کُرتا اور چست پاجامہ پہنتی تھیں۔ سر پر ہلکی خوب صورت پگڑی نما مکدہ ہوتی تھی۔"[9]

☆ہندو اور مسلم عورت کا خانگی مقام

ہندو گھرانے میں ہندو عورت کا اعلیٰ مقام و مرتبہ تھا اور اسے قابل احترام مقام حاصل تھا۔ خاص طور پر ماں کی حیثیت پہلے ہندو عورت کو خاص عقیدت حاصل تھی۔ مثلاً اگر کوئی ہندو کسی سفر پر جانے کا قصد کرتا تو سب سے پہلے اپنی ماں کے قدموں میں جھک کر دعائیں وصول کرتا۔ اپنی عقیدت کو ظاہر کرنے کے لیے ہندوستانی عورت اپنی آنکھیں اور ماتھا اپنے شوہر کے قدموں میں رگڑتی تھی۔ ہندو عورت اور مرد میاں بیوی کے تعلقات میں خوشگواری اور پائیداری پائی جاتی تھی۔ لوگوں کی موجودگی میں شرم و حیا کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور نئی دلہنیں لوگوں کی موجودگی میں شرم و حیا قائم رکھنے کے لیے اپنے شوہر کے سامنے ہلکا سا گھونگھٹ نکالتی تھیں۔ جیسا کہ مسلمان عورت اپنی شوہر کی وفات یا طلاق کے بعد ایک خاص مدت پوری کر کے دوسری شادی کر سکتی تھی جبکہ ہندوستانی عورت کی شادی صرف ایک مرتبہ ہی ہو سکتی تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک شادی کا رشتہ ایک ابدی معاملہ ہے نہ کہ ذاتی رشتہ ہے ہندوستانی عورت اگر بیوگی سے دوچار ہو جائے تو اسے دوسری شادی کی اجازت ہر گز نہیں مل سکتی تھی۔ البتہ بعض نچلی ذاتوں میں اس کے بر خلاف عورتوں کی دوسری شادی کر دی جاتی تھی۔ تاہم ہندو اکثریت اس کے خلاف تھی۔ ہندوستانی معاشرت کی پیروی میں بعض مسلمان بھی بیوہ عورتوں کی شادی سے گریز کرتے تھے۔ اس غلط رسم

کی وجہ سے عورت کا زندگی گزارنا مشکل تھا۔ اگر عورت نوجوانی میں ہی بیوہ ہوگئی تو یہ اس پر سراسر ظلم تھا کہ اس کی شادی نہ ہونے دی جاتی۔ اس پر افتاد یہ کہ اسے طرح طرح سے ذلیل ورسوا کر کے اس پر زندگی کے دن تنگ کر دیے جاتے تھے۔ بعض عورتیں معاشرتی و معاشی و بدحالی سے تنگ آکر یا تو خودکشی کر لیتی یا پھر معاشرتی برائیوں کا حصہ بن جاتیں۔ مسلمانوں میں بیوہ سے شادی کرنا احسن خیال کیا جاتا نیز عورت کی دوسری شادی پر کوئی قدغن نہیں لگائی جاتی تھی۔

☆ **تعلیم**

ہندوستانی معاشرے کے اگر ویدک دور کا جائزہ لیا جائے تو عورتوں کی تعلیم کا رواج سامنے آتا ہے۔ اس دور کی عورتوں میں بعض فلسفی بعض شاعرہ اور بعض معلم کے پیشے سے بھی وابستہ تھیں۔ گو اس دور میں بھی عورتوں کو سماجی مشکلات اور رکاوٹوں کا سامنا رہا تاہم انہوں نے عظیم قابلیت اور لیاقت کا مظاہرہ کیا۔ مذہبی تنظیموں اور اجتماعات میں بھی خود کو پیش کیا۔ بقول چودھری رحم علی الہاشمی:

"مذہب علم تعلیم یافتہ یا فلسفیانہ ذہانت والے طبقوں اور راہوں میں محدود تھا اور چونکہ یہ راستہ اُن لوگوں کی افتادِ طبع سے ہم آہنگ تھا، جن کا کام تصنیف وتالیف تھا۔"[10]

اسی دور میں مردوں کی طرح عورتوں کی تعلیم بھی گورکل میں ہوتی جس میں وہ اچاریہ کے ساتھ رہ کر اپنے مرد بھائیوں کے ساتھ تحصیل علم کرتی تھیں۔ ڈاکٹر محمد شہزاد شمس لکھتے ہیں۔

"اس عہد میں تعلیم یافتہ عورتوں کا دو طبقہ ملتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔اول سدیودویاس یعنی وہ عورتیں جو اپنی پڑھائی شادی کے بعد جاری رکھتی ہیں ۔دوم برہمویدتی یعنی وہ عورتیں جو شادی نہیں کرتیں اور اپنی پوری زندگی تعلیم حاصل کرنے میں وقف کر دیتی ہے۔ ایسی عورتوں میں گارگی، واچکنوی، واڈواپرا متیھتی سکھامتری اہم ہیں۔"[11]

لیکن وقت گزرنے کے ساتھ عورتوں کی تعلیم پر پابندیاں عائد ہوتی گئیں۔ عورتوں کی عزت و ناموس کو دھرم میں شامل کر لیا۔ حصول تعلیم پر پابندیاں سخت ہوتی چلی گئیں۔ گو یا اب شریف خاندانوں کی عورتوں کی تعلیم کی بجائے طوائفوں رقاصاؤں اور دل بہلانے والیوں کے ہاں تعلیم کے شوق کا رواج بڑھنے لگا۔ تعلیم کی پسماندگی کا اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھا جا سکتا ہے کہ اس وقت مروج لغات جو اس دور میں مرتب کی گئی تھی۔ اس میں استانی اور معلمہ کے الفاظ کو حذف کر دیا گیا۔ مسلمانوں کی ہندوستانی معاشرت پر اگر نگاہ ڈالے تو عورتوں کے معاملے میں تعلیم کا نقطہ نظر بڑا مثبت رہا۔ قرآن وحدیث کی روح سے "علم حاصل کرنا مرد اور عورت پر فرض ہے" کو پیش نظر رکھتے ہوئے عورتوں کی تعلیم کو ضروری قرار دیا گیا۔ تاہم پردے کی سختی کی وجہ سے مسلمان عورتیں حصول تعلیم سے دور ہوتی چلی گئی۔ مسلمان عورتیں آٹھ یا دس برس کی عمر تک تعلیم حاصل کرتیں اور بلوغت کو پہنچتے ہی انہیں ازدواجی رشتے سے منسلک کر دیا جاتا۔ البتہ جو اعلیٰ طبقوں سے تعلق سے رکھتی تھیں۔ انہوں نے تعلیم کے سلسلے کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر شمس اس بارے میں یوں رقمطراز ہیں۔

"البتہ اس سلسلے میں چند قوانین نے، جو اعلیٰ طبقہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنی تعلیم جاری رکھتے ہوئے سیاست، ادب، فلسفہ اور فنون لطیفہ میں

نہ صرف گہری دلچسپی دکھائی، بلکہ انہیں بلند مقام بھی حاصل ہوا۔ سیاست میں ملک کو راہ دکھانے والیوں میں کاکاتیا خاندان کی رانی رودرمبا اور سلطنت دہلی کے حکمران شمس الدین التمتش کی بیٹی رضیہ بیگم، جو تقریباً چار سال تک سلطنت دہلی پر حکمراں رہی۔ احمد نگر کی چاند بی بی، جو نقاب پوش، ہو کر اکبر فوج سے مردانہ وار لڑی اس کے علاوہ حبہ خاتون ایک قوم پرست کشمیری شاعرہ ہونے کے ساتھ ساتھ اکبر کی امپریل اصول وضوابط سے سرتابی کی۔ تارا بائی اور اہلیہ بائی کے نام بھی اہم ہیں۔ اس کے علاوہ اورنگ زیب النساء، جو ایک کاتب بھی تھی۔ شاہجہاں کی دو بیٹیاں، جہاں آرا اور روشن آرا کے علاوہ جیجا بائی وغیرہ نے ملک و قوم کے لیے نمایاں رول ادا کئے۔"[12]

تاہم ان خواتین کے علاوہ ہندوستانی عورت کی معاشرت دگرگوں تھیں اور ان کی معاشرتی حیثیت و مقام مسلسل پستی کا شکار ہو رہا تھا۔ عورتیں خواہ وہ مسلمان ہوں یا ہندو وہ صرف اور صرف مردوں کے بہلاوے کیف و نشاط اور آلہ تفریح تھیں۔

حوالہ جات

1۔ ڈاکٹر اقبال حسین، ہندوستانی تہذیب، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، 1986ء، ص۔ 88
2۔ حسن الدین احمد، ہندوستان کے معاشرتی مسائل، حیدر آباد دکن: ادارہ معاشیات، 1991ء، ص 44، 45
3۔ مرزا عظیم بیگ چغتائی، مقدمہ ڈاکٹر جسٹس شاہ محمد سلیمان، قرآن اور پردہ، علی گڑھ: انجمن اصلاح پردہ، 1928ء، ص۔ ب
4۔ حسن الدین احمد، ہندوستان کے معاشرتی مسائل، حیدر آباد دکن: ادارہ معاشیات، 1991ء، ص 33
ڈاکٹر تارا چند، ہندوستانی کلچر کا ارتقاء تاریخ کے آئینے میں، دہلی: شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی، 1967ء، ص۔ 36، 535.
6۔ ڈاکٹر بدنی پرشاد، مترجمہ مولوی اصغر حسین، ہندوستان کا قدیم تمدن دو ابتدائی ابواب، آلہ آباد: ہندوستانی اکیڈیمی یوپی، 1950ء، ص۔ 53، 52
7۔ ڈاکٹر اقبال حسین، ہندوستانی تہذیب، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، 1986ء، ص۔ 88
8۔ ڈاکٹر اقبال حسین، ہندوستانی تہذیب، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، 1986ء، ص۔ 97
9۔ ڈاکٹر قبال حسین، ہندوستانی تہذیب، لکھنؤ: اتر پردیش اُردو اکادمی، 1986ء، ص۔ 99
10۔ ڈاکٹر تارا چند، مترجم چودھری رحم علی الہاشمی، اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر، دلی: آزاد کتاب گھر، کلاں محل، 1944ء ص۔ 52
11۔ ڈاکٹر محمد شہزاد شمس، عورت اور سماج، نئی دہلی: اشاعت 2006ء، ص 31
12۔ ایضاً ص 56

References

1. Dr. Iqbal Hussain, Hindustani Tehzeeb, Lakhnaw: Utar Pardesh Urdu Academi, 1986, P-No.88
2. Hassan-ul-Din Ahmad, Hindustan key Maashrti Masail, Haiderabab Dakkan: Adara Mashiyat, Year of Edit 1991, Pg-44,45
3. Mirza Baig Chugtai, Muqdma , Dr. Justice Shah M. Suleman, Quran or Parda, Ali Garh: Anjman Islah Parda, 1928, P-No.Bey
4. Hassan-ul-Din Ahmad, Hindustan key Maashrti Masail, Haiderabab Dakkan: Adara Mashiyat, Year of Edit 1991, Pg-33
5. Dr. Tara chand, Hindustani Culture ka Irtqa tarikh k ayney mein, Dehli: Shuba Urdu Dehli University, 1967, P-No.35,36

6. Dr. Badni Parshad Matrjma Molvi Asghar Hussain, Hindustan ka Qadeem Tmadun do ibtadai Abwab, Ala Abad: Hindustani Acedmi UP,1950 , P-No.52,53
7. Dr. Iqbal Hussain, Hindustani Tehzeeb, Lakhnaw: Utar Pardesh Urdu Academi, 1986, P-No.88
8. Dr. Iqbal Hussain, Hindustani Tehzeeb, Lakhnaw: Utar Pardesh Urdu Academi, 1986, P-No.97
9. Dr. Iqbal Hussain, Hindustani Tehzeeb, Lakhnaw: Utar Pardesh Urdu Academi, 1986, P-No.99
10. Dr. Tara Chand, Mutrajm Ch. Rehm Ali Al-Hashmi, Deli: Azad Kitab Ghar, Klan Mehal, 1944, P-No.52
11. Dr. Muhammad Shahzad Shamas, Aurat aur Samaj, New Dehli: Year of Edit 2006, Pg-31
12. Ibid, Pg- 56